# ناول ''امراؤ جان آدا'': لکھنوی معاشرے اور تہذیب کی حقیقی دستاویز

محمد امان اے کے
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
8897246842

## ملخص

ناول ''امراؤ جان آدا'' کو 19 ویں صدی کے لکھنؤ کا عکاس کہنا غلط نہیں ہوگا۔ مرزا رسوا لکھنوی تھے اور لکھنؤ سے انہیں بے حد محبت تھی اسی لیے انہوں نے اپنے تمام ناولوں میں لکھنؤ اور اس کی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ ان سب باتوں سے پرے مرزا رسوا ایک حقیقت نگار اور معاشرے کی نبض کو خوب جاننے والے تھے، انہوں نے اپنے ناولوں میں لکھنؤ کی مبالغہ آمیز تعریف نہیں کی بلکہ اپنے ناولوں کے ذریعہ لکھنوی تہذیب و معاشرہ کو ہو بہو پیش کر دیا۔ ناول ''امراؤ جان آدا'' میں رسوا نے لکھنوی تہذیب کی عکاسی کے لیے خانم کے کوٹھے کا انتخاب کیا، کیوں کہ اس دور میں کوٹھے ہی ایسی جگہ تھی جہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ کوٹھوں میں شعر و شاعری کا جلسہ ہوتا ساتھ ہی رقص و سرود کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔

# ناول ''امراؤ جان آدا'': لکھنوی معاشرے اور تہذیب کی حقیقی دستاویز

مرزا محمد ہادی رسوا کا سب سے مشہور ناول ''امراؤ جان آدا'' ایک ایسا شاہکار ناول ہے، جسے اردو ناول کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یوں تو ان کے ناولوں کی فہرست میں ''افشائے راز''، ''ذات شریف''، ''شریف زادہ''' اور ''اختری بیگم'' جیسے ناول بھی موجود ہیں اور ان سبھی ناولوں میں انھوں نے اپنی صلاحیت اور زبان و بیان کی قدرت کا سکہ جمایا ہے، مگر ''امراؤ جان آدا'' اِن ناولوں میں سے ایک ایسا ناول ہے، جو درخشاں ستارے کی حیثیت سے نمودار ہوا اور ایک مدت گزرنے کے باوجود اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے برعکس جس قدر وقت گزرتا جا رہا ہے اس کا جوہر مزید نکھر کر سامنے آ رہا ہے کیوں کہ اس کی خوبیوں کی تلاش و تحقیق جاری و ساری ہے۔ بقول ڈاکٹر سنبل نگار:-

> ''کوئی کتاب اگر اپنے وجود میں آنے کے بعد پچاس سال بعد بھی دل چسپی سے پڑھی جائے تو اسے ادب عالیہ میں شمار کیا جانا چاہیے، امراؤ جان ادا تقریباً ایک صدی پہلے لکھی گئی تھی۔ اس سو سالہ زندگی میں کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب اس کی مقبولیت کو گہن لگا ہو۔ فن کے پارکھوں نے ہر دور میں اسے خراج تحسین پیش کیا اور اعتراف کیا کہ یہ اردو کو پہلا ناول ہے جو فن کی کڑی سے کڑی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ یہی اس کے بقائے دوام کا راز ہے۔''

(سنبل نگار، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 110-109)

ناول ''امراؤ جان آدا'' کو 19 ویں صدی کے لکھنؤ کا عکاس کہنا غلط نہیں ہوگا۔ مرزا رسوا لکھنوی تھے اور لکھنؤ سے انہیں بے حد محبت تھی اسی لیے انہوں نے اپنے تمام ناولوں میں لکھنؤ اور اس کی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ ان سب باتوں سے پرے مرزا رسوا ایک حقیقت نگار اور معاشرے کی نبض کو خوب جاننے والے تھے، انہوں نے اپنے ناولوں میں لکھنؤ کی مبالغہ آمیز تعریف نہیں کی بلکہ اپنے ناولوں کے ذریعہ لکھنوی تہذیب و معاشرہ کو ہو بہو پیش کر دیا۔ ناول ''امراؤ جان آدا'' میں شامل لکھنوی تہذیب کی عکاسی کو

تلاش کرنے سے قبل خود مرزا رسوؔا کی زبانی اس وقت کے معاشرے کا حال معلوم کر لینا درست ہوگا۔ "ذاتِ شریف" کے دیباچے میں رسوؔا نے زوال پذیر لکھنؤ اور اس کی تہذیب کو یوں بیان کیا ہے:

"یہ شہر جامعِ اضداد ہے۔۔۔۔اخلاقی صفتوں کی افراط وتفریط جیسی اس شہر میں ہے اور کہیں کم ہوگی۔اس شہر میں نئی بات کا رواج مشکل سے ہوسکتا ہے۔۔۔ کیمیا گری کے فن کو اب دنیا لغو سمجھتی ہے، یہاں ہر محلے میں دو تین کیمیا گر آپ کو مل سکتے ہیں جن کو اپنے بنائے ہوئے سونے میں ایک انچ کی کسر کا بھی شبہ نہیں ہے۔۔۔۔۔گو کہ اصول کچھ نہ ہو۔۔۔جن و پری کی تسخیر کا شوق تیس چالیس برس پہلے بہت تھا۔۔۔ اس شہر میں خاندانی علم وفن بہت پوچھا جاتا ہے۔۔کوئی شخص کسی علم یا فن کا کامل برآمد روزگار کیوں نہ ہوا گر اس کے آباواجداد مشاہیر سے نہ تھے تو۔۔۔۔ وہ افلاطون وقت بھی ہو تو کوئی اس کو نہ پوچھے گا۔۔۔۔کوئی کتاب لکھیے۔کوئی اخبار نکالیے اس شہر میں اس کا پوچھنے والا نہ نکلے گا۔اس لیے کہ یہ خیال دلوں میں سمایا ہوا ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔۔۔اس شہر کی ناقدر شناسی ضرب المثل ہے۔۔مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ ایسے شاعر اور مرثیہ خواں اور لکھنؤ خاص شیعوں کا شہر۔۔۔مگر محرم میں یہ دونوں بزرگ ہمیشہ باہر جایا کیے۔۔۔آتشؔ فاقے کرتے کرتے مرے ناسخؔ بھاگے بھاگے پھرے۔"

(مرزا رسوؔا، ذاتِ شریف، اشرفی بک ڈپو لکھنؤ، ص 5،4،3)

مندرجہ بالا اقتباس سے مرزا رسوؔا کی معاشرے پر گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرزا لکھنؤ سے محبت کرتے تھے اور اپنی محبت کو ایسے لٹتے دیکھ کر درد محسوس کرتے تھے۔ ناول ''امراؤ جان اداؔ'' میں رسوؔا نے لکھنوی تہذیب کی عکاسی کے لیے خانم کے کوٹھے کا انتخاب کیا، کیوں کہ اس دور میں کوٹھے ہی ایسی جگہ تھی جہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔کوٹھوں میں شعر وشاعری کا جلسہ ہوتا ساتھ ہی رقص وسرود کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔

**طوائف:-** طوائف 19 ویں صدی کے زوال پذیر لکھنوی تہذیب کا حصہ تھیں۔ یہ ایسا دور تھا جب فنونِ لطیفہ لکھنؤ کے تمام لوگوں روزمرہ کا حصہ تھے۔اس وقت کوٹھوں کے علاوہ ایسی کوئی جگہ ہی نہ تھی

جہاں لوگ تفریح کے لیے جاتے، اور اپنے ذہن کی تسکین اور شوق کو پورا کر سکتے تھے۔ لوگ طوائف کو برا تو سمجھتے تھے لیکن شرفا کا ان کے کوٹھوں پر جانے کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ شادی بیاہ کی رسموں، نذر و نیاز اور سوز خوانی کے مواقع میں طوائفوں کو بلانا شان کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے شرفا کے یہاں عورتوں کی تعلیم معیوب تھی جبکہ طوائف اعلیٰ تعلیم یافتہ، فنونِ لطیفہ سے واقف، شائستہ زبان بولنے والی اور آدابِ محفل جاننے والی ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نوابین اپنے بچوں کو آدابِ مجلس سیکھنے کے لیے کوٹھوں پر بھیجا کرتے تھے۔ طوائفوں میں کچھ کا پیشہ رقص ہوتا، کچھ رقص اور موسیقی دونوں میں ماہر ہوتیں اور کچھ اپنے حسنِ صورت سے لوگوں کو اپنے دام میں لیتیں۔ طوائف کے کوٹھے پر باقاعدہ طوائف کا سودا ہوتا تھا۔ تنخواہ مقرر کی جاتی، مدت کا تعین ہوتا اور معاہدے کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی۔ بعض طوائف کسی نہ کسی شخص یا دربار سے منسلک ہو جاتی اور بعض کا دروازہ سب کے لیے کھلا رہتا۔ طوائفوں کے علاوہ لکھنؤ میں پتریاں بھی ہوا کرتی تھی جو سال میں ایک مرتبہ گاؤں گاؤں گھوم کر کسی امیر یا رئیس کے گھر اتر جاتیں اور جو کچھ ملتا مجرا، شادی بیاہ کے موقعے وغیرہ سے اپنی کمائی کر لیا کرتیں۔

ناول ''امراؤ جان ادا'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مندرجہ بالا سبھی باتیں اس کے صفحات میں مل جائیں گی۔ ناول میں خانم کا کوٹھا ان سب چیزوں کو قاری کے آگے پیش کرنے میں کسی ڈرامے کے اسٹیج کا سا کام کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ رسوا نے یہاں طرح طرح کے لوگوں کے آنے کا ذکر کیا ہے جن میں بوڑھے نواب صاحب، مولوی صاحب، طالب علم، چھوٹے موٹے رئیس، خوبرو نوابین اور ڈاکو بھی شامل ہیں۔ خانم کی طوائفوں میں امراؤ جان رقص و موسیقی کی ماہر تھیں اور اعلیٰ مذاق رکھتی تھیں، ایک خورشید تھی جو قبول صورت تھی لیکن آواز اچھی نہ تھی اس کا صرف ناچ کا مجرا ہوتا تھا، گانے میں بیگا جان ماہر تھیں لیکن اس کی صورت ایسی تھی کہ رات کو دیکھو تو ڈر جائے۔ بسم اللہ کو پٹہ، ٹھمری کے سوا کچھ نہیں آتا تھا وہ بس اپنی اداؤں سے لوگوں کو اپنے شکنجے میں باندھنا جانتی تھیں۔ خانم اپنی نوچیوں کا بڑے ہی سلیقے سے سودا کیا کرتی تھیں۔ امراؤ جان رسوا سے کہتی ہیں کہ سبھی طوائفوں میں یہ بات عام تھی کہ وہ کسی نہ کسی شخص کو اپنا بنائے رکھتی تھیں جس سے ان کا جی بہلا رہے، سودا سلف منگا لیں یا مجرے وغیرہ کا انتظام ہو جائے۔ یہ طوائف ان سے محبت کرتی تھی اور انہیں اپنے سے دور جانے نہیں دیا کرتی تھی۔ ایک جگہ امراؤ کہتی ہے:

"امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔۔۔۔۔خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔طبیعت میں سفلہ پن تھا،کسی پر بند نہ تھیں۔"

(مرزا رسوا،امراؤ جان ادا،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،ص105،2014)

مرزا رسوا نے امراؤ کے اناؤ کے سفر کے دوران رائے بریلی میں اس کی ایک پتریا سے ملاقات کے ذریعہ اس وقت کے معاشرے میں ان کے وجود کی نشاندہی کی ہے۔اس کے علاوہ ان کے پیشہ کرنے کے ڈھنگ کو بھی بڑی اچھی طرح سے پیش کیا ہے:

"نصیبن: سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔امیر رئیسوں کے مکان پر جاکے اترتے ہیں۔جو کچھ جس کے مقدور ہوتا ہے ہمیں دیتا ہے۔کہیں مجرا ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔"

(مرزا رسوا،امراؤ جان ادا،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،ص173،2014)

**لکھنؤ کے نوابین اور شرفاء:-** آج بھی لکھنؤ کو نوابوں کا شہر ہی کہا جاتا ہے۔مرزا رسوا نے ناول میں بھی کئی ایسے کردار پیش کیے ہیں جو نواب یا رئیس ہیں۔اس کے علاوہ معاشرے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والوں سے لے کر جعل سازوں اور ڈاکوؤں کا شمار ہوتا ہے۔مرزا رسوا نے ناول کے مختلف حصوں میں ایسے کرداروں کو دکھا کر معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔رسوا نے خانم کے کوٹھے کا انتخاب کر کے اپنا کام آسان کر دیا۔خانم کے کوٹھے میں جہاں نواب سلطان جیسے شریف نواب بھی آتے ہیں وہیں نواب چھبّن جیسے لٹے پٹے نواب بھی، یہاں خاں صاحب جیسے شرابی اور ڈھیٹ قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں تو وہیں گوہر مرزا جیسے چاپلوس اور موقع پرست بھی،فیض علی جیسے ڈاکو بھی یہاں موجود ہوتے ہیں اور مولوی صاحب جیسے عالمِ دین بھی۔رسوا نے نواب چھبّن کی وساطت سے اس زمانے کے نوابوں کا حال بیان کیا ہے کہ وہ لوگ اپنی وضعداری برقرار رکھنے کے لیے اپنی ساری چیزیں گروی رکھ دیتے ہیں اور پھر کبھی اس کے چھڑانے کی فکر نہیں کرتے اور آخر کار اسی طرح اپنی ساری دولت لٹا دیتے ہیں۔بسم اللہ کے پوچھنے پر نواب چھبّن یوں کہتے ہیں:

''نواب: سود کا حساب کس نے آج تک کیا ہے۔جو چیز گروی ہوئی پھر اس کے چھڑانے کی نوبت کبھی نہیں آئی جو سود کا حساب کیا جاتا۔''

(مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص134، 2014)

اس دور کا معمول یہ تھا کہ نوابوں اور معاشرے کے دیگر مردوں کو گھر کے باہر سب کچھ کرنے کی آزادی ہوتی تھی لیکن گھر کے اندر عورتوں کی ہی حکمرانی ہوتی تھی۔ گھر کے معاملات یہ عورتیں ہی طے کرتیں، مرد صرف مہینے بھر کا سودا گھر میں جمع کر دیتا تھا۔ اکبر علی خاں جب امراؤ کو اپنے گھر پناہ دیتا تو وہ اسے گھر سے متصل ایک الگ کمرے میں رکھتا۔ اس سلسلے میں اکبر علی کی ماں بوا امیرن سے کہتی ہے:

''بیگم: (امیرن سے) اس کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں؟ باہر جس کا جی چاہے آئے۔ گھر میں کسی کا کیا کام ہے؟ اے لو، ان سے (اکبر علی خاں کے باپ) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں میں نہیں حامی بھری۔"

(مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص138، 2014)

اکبر علی خاں کے گھر کی تصویر پیش کر کے رسوا نے لکھنؤ کے متوسط طبقے کے لوگوں کے گھروں کا نقشہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ امراؤ کہتی ہے:

''مکان میں جا کے دیکھتی ہوں، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانبے کے مٹکے، دیگ، گگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی کے پلنگ، مسہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فروش، مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہوا، باورچی خانہ میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہے۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چھینٹے پڑے ہوئے۔ بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا۔ امامن نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔''

(مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص134، 2014)

رسوا نے ناول میں نواب محمود علی کے امراؤ کے شوہر ہونے کے دعوے کے ذریعے اس وقت کے عدالت کا حال بھی بیان کیا ہے جہاں مقدمہ جیتنے کے لیے باریش مولوی صاحبان کو جھوٹے گواہ کے طور پر لایا جاتا اور جعل سازوں کی مدد سے مقدمے اپنے حق میں کیے جاتے تھے۔

**لکھنوی شعروادب:-** شعروشاعری لکھنوی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ناول ''امراؤ جان آدا'' میں نہ صرف شعروشاعری کا ذکر ہے بلکہ کہانی کا آغاز ہی محفلِ مشاعرہ سے ہوتا ہے۔لکھنؤ میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے،اکثر لوگ کسی باذوق شخص کے گھر اکھٹے ہوجاتے اور محفل جم جاتی۔ان محفلوں میں پہلے سے کوئی طرح مقرر نہیں ہوتی تھی، نہ کسی مضمون کی قید ہوتی تھی اور نہ بہتوں سے وعدے لیے جاتے تھے۔ ہر شاعر اپنی کوئی تازہ تخلیق سناتا اور اگر کوئی حاضر محفل نہ ہوتا تو اپنا کلام کسی کے ہاتھ بھیج دیا کرتا۔ان مشاعروں کے انعقاد میں اہتمام ونفاست کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔رسوؔا نے ناول میں منشی احمد حسین کے گھر منعقد مشاعرے کا منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری خود کو اس محفل میں موجودگی کا احساس کرتا ہے:

> ''گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تا کہ شام تک زمین سرد رہے۔اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑے ڈال کے منڈیر پر چنوادی گئی تھیں۔ان پر سفید سفید پان کی سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمبا کو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خمے حصوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی اس لیے روشنی کا زیادہ انتظام نہیں کرنا پڑا۔صرف ایک کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا۔۔۔ پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعروسخن کا چرچا ہونے لگا۔''

(مرزا رسوؔا،امراؤ جان آداؔ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،ص38،2014)

مشاعروں کے دوران ''واہ واہ''، ''سبحان اللہ''، ''کیا درفشانی ہے'' وغیرہ وغیرہ جیسے داد کے جملے کہے جاتے تھے اور شاعر فرشی سلام کرتے ہوئے ''آپ کی عنایت''، ''پرورش''، ''بندہ نوازی''، ''تسلیم'' اور ''یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے'' وغیرہ جیسے الفاظ کہا کرتے تھے۔مشاعرے کے دوران صرف تعریف ہی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ کبھی نکتہ چینی کرنا،شعر میں عیب نکالنا اور دہلی ولکھنؤ کی شاعری پر بحث چھڑ جانا عام بات ہوا کرتی تھی۔لکھنؤ میں نازک خیالی کا بڑا دھیان دیا جاتا تھا۔مشاعرے کے بیچ بعض دفعہ

شاعر کو اپنے شعر کی وضاحت بھی کرنی پڑتی تھی۔ رسوؔا نے ناول میں ان سب چیزوں کو مشاعرے میں پیش کر کے اپنی جزئیات نگاری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ناول کے مشاعرے میں یہ سب ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایک جگہ آغا صاحب کے ایک شعر میں وہ علمِ ریاضی کی ایک علامت کا استعمال کر کے اپنی نازک خیالی ظاہر کرتے ہیں جس کے معنیٰ انہیں حاضرین کو سمجھانے پڑتے ہیں۔ شعر یوں ہے:

تری نازک کمر کے باب میں چہلک لگا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی گٹھل ہو

لکھنؤ میں ایسے بھی لوگ تھے جو دوسروں کے مضمون چرا کر نیا شعر گڑھ لیتے تھے، کچھ تو دوسروں کے کلام کو اپنے نام سے پڑھا کرتے تھے۔ ایسے لوگ بھی لکھنؤ میں موجود تھے جو خود کو استاد شاعر کہتے اور لکھنؤ سے باہر لکھنؤ کے مشہور و معروف استاد شعراء کے کلام یا مراثی پڑھا کرتے تھے۔ ان سب کا مرزا رسوؔا نے ناول میں ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ رسوؔا نے مظہر الحق نامی ایک نوجوان شاعر کے ذریعے جدید شاعری (نظم) کو بھی پیش کیا ہے۔ اس سے 19 ویں صدی کے اواخر کی شاعری کا حال ظاہر ہوتا ہے کہ کیسے نئی نسل کے لوگ نظموں کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ اس نظم میں شاعر نے شعر و شاعری کے گرتی معیار اور فقط داد کی خاطر شعراء اپنے ساتھ ایک ہجوم کو لے کر چلنے کی مذمت کی گئی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ نظم بھی اس زمانے کے زوال پذیر لکھنؤ کی بہترین تصویر پیش کرتی ہے۔

**لکھنوی معاشرے میں موسیقی:-** موسیقی لکھنوی تہذیب کا اہم حصہ تھی، لہٰذا طوائف کو موسیقی سکھانے کے لیے ایک ماہر استاد مقرر ہوتے تھے۔ امراؤ جان کو موسیقی سے دلچسپی تھی اسی لیے وہ بہت جلد اس میں ماہر ہو گئیں۔ جب موسیقی کی تعلیم ہوتی تو خانم خود وہاں موجود رہتیں۔ اس سلسلے میں رسوؔا نے امراؤ جان کے رام کلی گانے اور غلط سر لگانے کا واقعہ بیان کیا ہے جہاں خانم اس کی غلطی پکڑ لیتی ہیں اور استاد جی کو غافل دیکھ کر برہم ہوتی ہیں۔ ناول میں موسیقی کے باب میں خانم اور استاد جی دونوں کو ماہر دکھایا گیا ہے اور امراؤ جان کو موسیقی دلچسپی ہے اس لیے وہ دونوں سے مستفید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ امراؤ اور بیگا جان کے بیچ موسیقی سے متعلق گفتگو میں سرتیاں، تینوں گرام، دھناسری، آستھائی، دہرپد وغیرہ کو موسیقی کے فن

اوراصولوں کو جاننے والا ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔

**وضع قطع اور ملبوسات:۔** لکھنؤ کے شرفا کا عام لباس چپکن ،اچکن ،انگرکھا اور دگلے کے کرتے ہوا کرتے تھے۔ان میں سے بالا بر اور انگرکھے دہلی دربار کی ایجاد تھی جو دہلی سے لکھنؤ آنے والے شرفا کے ساتھ لکھنؤ آ گئی تھی۔لکھنؤ میں اس انگرکھے میں کچھ ترمیم کر کے چپکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی۔اور لکھنؤ کے نوابوں کے آخری دور میں انگرکھے اور چپکن کو ملا اچکن ایجاد ہوئی۔اچکن کی شہرت کو عبد الحلیم شرؔر یوں رقم کرتے ہیں:

''اچکن لوگوں کو بہت پسند آئی اس کا رواج شہر سے گزر کے دیہاتوں میں بھی شروع ہوا اور آناً فاناً سارے ہندوستان میں پھیل گیا، یہی اچکن حیدرآباد پہنچ کے تھوڑی سی ترمیم کے بعد شیروانی بن گئی۔''

(عبدالحلیم شرؔر،لکھنؤ؛مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور،ص278، 2000)

لکھنؤ کی عورتوں کا عام لباس شرؔر یوں بیان کرتے ہیں:

''تنگ مہری کا کھینچا ہوا پاجامہ سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینوں کی کھینچی ہوئی انگیا، اور پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لیے ایک عجیب وغریب کرتی جو آگے کی طرف سے اس حد تک کاٹ دی جاتی جہاں تک جسم پر انگیا کا تصرف رہتا اس میں نہ آستینیں ہوتیں اور نہ سینے پر اس کا کوئی حصہ رہتا، دو لمبے بندوں کے ذریعے سے جو شانوں پر سے ہو کے آتے پیٹ اور پیٹھ پر متعلق ہوتی، اور اس کے اوپر تین گز کا چنا ہوا باریک دوپٹہ جو سر سے اوڑھا جاتا۔''

(عبدالحلیم شرؔر،لکھنؤ؛مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور،ص300، 2000)

عورتوں کے لباس کی نوعیت اور اختراعیت میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔عورتوں کی صحبت سے جس علاقے کے مردوں کے لباس ہی زرق برق اور چمکدار ہوں تو وہاں کی عورتوں کے لباس کتنے عمدہ ہوں گے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔خوش حال گھرانوں کی عورتیں سر سے پاؤں تک زیورات سے لدی رہتی تھیں۔غریب شریف گھرانوں میں بھی اپنی استطاعت کے مطابق زیور پہننے کا رواج تھا۔کم زیور معیوب نہیں تھا،لیکن بقولِ مرزا جعفر:

''جھوٹے موتی یا جواہرات یا ملمع کردہ طلائی زیور کا استعمال ناقابلِ عفو گناہ تھا۔
دیکھنے والوں کی نظریں فوراً زیورات کے اصلی یا نقلی ہونے کو پہچان سکتی تھیں۔''

(مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص126، 1981)

مرزا رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' میں بیگمات کے ملبوسات و زیورات کا بیان نواب سلطان کی بیگم کے ملبوسات و زیورات سے کیا ہے۔ امراؤ جان اس کردار کے ملبوسات کا ذکر یوں کرتی ہے:

''مہین، بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کچلی کا شلوکہ پھنسا پھنسا، سرخ گرنٹ کا پائجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھ میں سونے کی سمرنیں، بازوؤں پر نورتن، پاؤں پر سونے کی بیڑیاں۔''

(مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص201، 2014)

**لکھنوی معاشرے کا دسترخوان:-** لکھنؤ کے دسترخوان صرف شاہی دربار، امیروں کے محل اور رئیسوں کی ڈیوڑھیوں تک محدود نہیں تھے، بلکہ گلی کوچوں، بازاروں اور عام گھروں میں بھی یہ اپنی انفرادیت کے ساتھ موجود تھے۔ بازار میں شیرمال، کباب، قورمہ، پلاؤ اور فیرینی کا رواج تھا۔ لکھنؤ کے باورچیوں اور طباخوں کے محلے اور علاقے شہرت رکھتے تھے۔ ان کے پکانے کے ڈھنگ، مسالوں کے انتخاب اور ان کے استعمال میں ایک انفرادیت ہوتی تھی۔ گھر کی عورتیں خود اپنے ہاتھوں سے ہانڈی پکاتی تھیں، اور کھانے کو مزے دار اور لذیذ بنانے کے گر جانتی تھیں۔ اس سے متعلق حسن واصف عثمانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''کسی کے پکائے ہوئے کھانے میں لذّت، ذائقہ اور لطافت نہ ہو تو یہ بڑی بوڑھیاں کس حقارت سے کہتی تھیں کہ کیا چھچھوندر ماری تھی کہ ہاتھ میں ذائقہ ہی نہیں۔''

(حسن واصف عثمانی، لکھنؤ کا گمشدہ دسترخوان: چند پہلو، نیا دور، اودھ نمبر حصّہ دوم، لکھنؤ، ص122، فروری - مارچ1999)

کھانے کے اقسام کی بات کی جائے تو تندوری روٹی، نان خمیر اور نانِ فطیر کا رواج صدیوں سے تھا۔لکھنؤ میں اس میں میدے، گھی اور دودھ کی آمیزش سے بننے والے شیر مال اور آسان ہضم ہو جانے والی چپاتی کی ایجاد ہوئی۔اسی طرح ایرانی کلچہ میں تصرف کر کے لکھنؤ والوں نے اس کو نہاری سے وابستہ کر لیا۔یوں تو الہ آباد کی نہاری زیادہ مشہور ہے جو کہ پائے اور ہڈیوں سے تیار ہوتی ہے لیکن لکھنؤ والے پائے کی نہاری پسند نہیں کرتے تھے، یہاں خاص مسالوں اور گوشت کی بوٹیوں سے نہاری تیاری ہوتی ہے۔

لکھنؤ کے دسترخوانوں پر شوربہ دار سالن ہوتے تھے، جس میں پستہ اور بادام شامل ہوتے تھے۔قیمہ، کوفتہ اور کباب خاص و عام کے دسترخوان کی زینت ہوتے تھے۔لکھنؤ میں شامی کباب، سیخ کباب اور گلاوٹ کباب بہت باریک پسے ہوئے قیمے اور خاص مسالوں سے تیار کر کے انہیں لذیذ اور ذائقہ دار بنایا جاتا تھا۔لکھنؤ کے لوگ بریانی سے زیادہ پلاؤ پسند کرتے تھے، جس کی وجہ سے لکھنؤ میں بے شمار اقسام کے پلاؤ بننے لگے۔اسی طرح لکھنؤ والے کھیر کی جگہ فیرنی کو ترجیح دیتے تھے۔

رسوؔا نے اپنے ناول میں لکھنؤ کے دسترخوان کا بھی ذکر کیا ہے۔جب امراؤ جان لکھنؤ چھوڑ دیتی ہیں تو انھیں کانپور کی مسجد میں مولوی صاحب کے دیے چار خمیری روٹیوں اور نیلے شوربے کو دیکھ کر لکھنؤ کے دسترخوان کی یاد آتی ہے۔اس کے بعد جب وہ کانپور میں بیگم صاحبہ (نواب سلطان کی بیگم) کی کوٹھی میں جاتی ہے تب اسے لکھنؤ کا سا دسترخوان نصیب ہوتا ہے۔امراؤ کہتی ہے:

> ''دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بورانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقرخانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی غرضکہ ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔''
>
> (مرزا رسوؔا، امراؤ جان اداؔ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص205، 2014)

**لکھنوی معاشرے کے اخلاق وعادات:-** لکھنوی معاشرے کے اخلاق و عادات بہت اعلیٰ تھے۔لکھنؤ والے شرافت، نرم گفتاری اور منکسر المزاجی کے لیے جانے جاتے تھے۔ان کی دوست پروری، شریف نوازی اور تکلفات وغیرہ لکھنوی معاشرے کو دوسرے معاشروں سے ممتاز کرتے تھے۔شرؔر لکھنؤ کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''دراصل لکھنؤ میں ایشیائی تہذیب کو انتہائی ترقی ہو گئی اور کسی مقام کے لوگوں

میں معاشرت کے وہ قواعد نہیں رہے جن کے اہلِ لکھنؤ عادی ہو گئے ہیں۔''

(عبدالحلیم شرر، لکھنؤ: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور، ص320، 2000)

لکھنؤ کے شرفا چاہے ہندو ہوں یا مسلمان ان کے روز مرّہ کا دستور تھا کہ صبح صبح عبادت کرتے۔ اس کے بعد وہ خانگی ضروریات کی طرف توجہ مبذول کرتے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنا میل ملاپ تھا کہ عقائد و رسومات کے جدا ہونے کے باوجود کوئی ایک دوسرے کی عبادت میں خلل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسروں کے مذہبی عقائد کا احترام کرنا عین شرافت سمجھا جاتا تھا۔

لکھنؤ ایسے لوگوں سے بھرا پڑا تھا جو مالی تنگی کی صورت میں بھی اپنی شان پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں جب قحط پڑا تھا اور لکھنؤ کے شرفا تک فاقہ کرنے لگے تھے، تب وہ اپنی بے عزتی سے بچنے کے لیے رات میں مزدوروں میں مل کر کام کیا کرتے تھے۔ اگر شرفا کے گھر میں تنگی ہوتی تو بھی وہ فیاضی کرنے میں نہیں چوکتے۔ غریبوں میں بھی ایسے شریف زادے ہوتے جو اپنی استطاعت کے مطابق کماتے اور قناعت کی زندگی گزارتے تھے۔ رسوؔا نے ناول میں خوددار شرفا کی مثال نواب چھبّن کے طور پر پیش کی ہے جسے خانم کے آگے سبکی کا احساس ہوا تو وہ چلے گئے، دریا میں کود کے جان دینے کی کوشش کی اور بچ نکلنے کے بعد کبھی کوٹھے کا رخ نہ کیا۔ نواب چھبّن کے علاوہ خود امراؤ کا بھائی بھی جب اپنی بڑی بہن کو ایک طوائف کے روپ میں اپنے ہی گاؤں میں دیکھتا ہے تو آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور قتل تک کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بہن کی محبت اور اس کی خودداری کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پاتا اور آخر امراؤ کو مر جانے کا طعنہ دے کر روتا ہوا وہاں سے چلا جاتا ہے۔

طوائف کو لوگ شان و شوکت کی چیز سمجھ کر ہر محفل میں تو لے جاتے اور اس کی موجودگی اپنی رئیسی اور شان کو بڑھاتے تھے لیکن ان سب کے باوجود وہ محترم نہیں تھی اور کہیں بھی، کسی بھی شریف کے گھر اس کا آنا جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ طوائفیں ان چیزوں کا خیال رکھا کرتی تھیں۔ ناول میں بھی امراؤ جان کو رسوؔا جب شعری محفل میں تشریف لانے کی دعوت دیتے ہیں تو وہ کہتی ہے:

''مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن صاحب خانہ کو یا کسی اور صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔''

(مرزا رسوؔا، امراؤ جان اداؔ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص36، 2014)

اسی طرح اکبر علی کی بیوی جب امراؤ سے اپنے گھر نہ آنے کی شکایت کرتی ہے تو وہ کہتی ہے:

''آپ کی اجازت کی ضرورت تھی وہ حاصل ہوگئی۔اب حاضر ہوں گی۔''

(مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص233، 2014)

خلاصۂ کلام یہ کہ، مرزا ہادی رسوا نے ناول ''امراؤ جان ادا'' کے ذریعے لکھنوی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ناول میں انہوں نے اپنی جزئیات نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ رسوا نے لکھنوی تہذیب کے ہر پہلو کو اپنی ذہانت اور اپنی فنّی سوجھ بوجھ سے بڑی نفاست کے ساتھ ناول کے پلاٹ کے ساتھ پرویا ہے، جس کی وجہ سے اردو ناول نگاری میں تہذیبی مطالعے اور معاشرتی بیان کی راہ ہموار ہوئی۔ ناول امراؤ جان ادا کو 19 ویں صدی کے زوال پذیر لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کی دستاویز کہنا غلط نہیں ہوگا۔

☆☆☆